اقبال کا تصورِ خودی

از

ڈاکٹر سید عابد حسین
ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

اقبال اکیڈیمی لاہور

قیمت -/۸/-

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ۔ ۸/عہ

شرحِ اسرارِ خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے۔ ۸/عہ

تعلیماتِ اقبال۔ 〃 〃 〃 ۔ ۸/عہ

اقبال اور پیامِ حریت۔ 〃 〃 〃 ۔ ۸/

اقبال کا تصورِ زمان و مکان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۰/

موت و حیات اقبال کے کلام میں 〃 〃 ۔ ۱۴/

تعلیم کا مسئلہ۔ 〃 〃 〃 ۔ ۸/عہ

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایم اے ۔ ۱۰/

یادِ اقبال۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ ۸/عہ

حقیقتِ نفاق۔ مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی۔ ۸/عہ

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ 〃 〃 ۔ ۸/عہ

اسلام اور وطنیت۔ 〃 〃 〃 ۔ ۶/عہ

معرکۂ اسلام و جاہلیت۔ 〃 〃 〃 ۔ ۸/عہ

محمد عبدہٗ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات ۔ عہ/

اقبال کا تصورِ خودی

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ اقبال کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے۔ یہ سن کر شاید آپ کے ذہن میں الجھن پیدا ہو کہ بھلا فلسفہ شعر کیونکر ہو سکتا ہے۔ فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بیجان تعبیر ہے اور شعر اسکی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورت کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کر دیتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے شاعر نبضِ کائنات کی تڑپ، قلبِ حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے اور اپنے احساسات کو مترنم نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے جو ہمارے دل میں اتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است

شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

کیا اقبال کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہے؟

سا جسے اقبال کے کلام سے ذرا سا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جب شعر کے لئے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفے کی صرف ایک ہی صفت مدِنظر ہوتی ہے یعنی موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ہے کہ وہ ایک کلی تصورِ حیات پیش کرتا ہے۔ اس کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے۔ جسے ہم فلسفہ تمدن کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر طرزِ ادا کو دیکھئے تو وہ اسی سوز و گداز، رنگ و آہنگ سے لبریز ہے جو ایشیائی شاعری کی جان ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبال کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت یعنی مسلمانوں سے ہے کل نوعِ انسانی سے نہیں۔ اُن کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے۔ جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ہے جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ہیں۔ مگر ذرا غور سے دیکھئے تو محض جذبات و کیفیات کی مصوری اور چیز ہے اور زندگی کے ایک مکمل تصور کی

تعمیر اور چیز ہے۔ جذبات کل انسانوں میں یکساں ہیں۔ لیکن نصب العین حیات کی تشکیل میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک عالمگیر انسانی تمدن کا خیال ہر زمانے میں بعض لوگوں کے پیش نظر رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن محض مجرد تصور یعنی فلسفے کی شکل میں اس تصور کو کسی ایک شخص کے قلب سے بھی وہ زندہ تعلق پیدا نہیں ہوا جو اسے موضوعِ شعر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اب تک ہر شاعر اس پر مجبور رہا ہے کہ انسانیت کا عکس کسی خاص ملت یا قوم کے آئینے میں دیکھے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اور ملت کے تصورات میں کون زیادہ وسیع ہے اگر آپ قوم سے اہل مغرب کی اصطلاح میں وہ جماعت مراد لیں جس میں قدر مشترک محض نسل اور وطن ہے اور ملت اقبال کے محاورے میں اس گروہ کو کہیں جس کے لئے ایک روحانی اور اخلاقی نصب العین رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ملت کے تصور کا وسیع تر اور انسانیت سے قریب تر ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ نسل و وطن کا فرق دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور اگر اس پر زیادہ زور دیا جائے تو نوع انسانی میں اتحاد پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے متحد کر دینا کم سے کم خیال میں آسکتا ہے۔ دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جو نصب العین اقبال کے ذہن میں ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ محض یہ بات ہے کہ وہ ملت کے تصور سے وابستہ ہے اسے تنگ اور محدود کہنے کے لئے کافی نہیں

اقبال کی شاعری اور ان کے نصب العین زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کے
لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں
جب افق ہند سے وہ ہلالِ نو نمودار ہوا جو ایک دن فلک شعر پر ماہِ کامل بن کر
چمکنے والا تھا اس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالم اسلام پر حزن و یاس کی
تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے بدتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی جہل
اور غلامی کی بدولت ان کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی اور جدھر
آنکھ اٹھا کر دیکھئے راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مغربی فاتحوں
کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر مستولی تھی
وہ اس بے پناہ قوت سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے مگر یہ مقناطیس کی طرح انہیں
اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس زمانے میں ایک باہمت، خوددار اور مدبر مسلمان
سید احمد خاں نے جسے یقین تھا کہ ملت اسلامی کی سطحی کمزوری کی تہ میں فولاد کی
قوت پنہاں ہے، مسلمانوں کو اس پر ابھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی
تمدن سے رگڑ کھانے دیں۔ اس رگڑ سے ابتدا میں انہیں سخت صدمہ پہنچا مگر
اسی سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنہوں نے ان کے دلوں میں غیرت و حمیت کی
آگ بھڑکا دی۔

تدبیر و سیاست کو چھوڑ کر صرف شعر کے میدان کو دیکھئے تو آپ کو دو ممتاز

صورتیں نظر آتیں گی جنہوں نے مسلمانوں کے مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک حالی جس نے سوز و درد کے لہجے میں ملت اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گذشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرے اکبر جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔ حالی جدت پسند تھے' قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبر قدامت پسند تھے' نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزت قومی کے جذبے کو ابھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دلایا۔ اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی۔

لیکن ان دونوں بزرگوں کی نظریات کی تہ تک نہیں پہنچی۔ انہوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا۔ لیکن اس مرض کا سبب نہیں پہچان سکے۔ اکبر نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالی نے یہ کہا کہ وہ اجتہاد فکر اور وسعت نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز

سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس وجہ کے معلوم کرنے کے لئے اقبال کی فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی۔ شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا اور اسی کاہلی اور عیش پرستی نے انہیں رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت سے محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا لیکن اقبال، جس کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفہ تمدن اور فلسفہ نفس پر بھی عبور رکھتی تھی، اس توجیہہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ ایک اولوالعزم قوم میں جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا ہو۔ جسمانی تعیش اور کاہلی کی لہر جب تک اس کے اندر روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو، ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے۔ یہ روحانی تعیش اور کاہلی اقبال کے نزدیک وحدت وجود کے عقیدے پر مبنی ہے جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں سے فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل خود اقبال کی زبان سے سنئے:-

"مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی

تفسیر کی اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے جزو و کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگ چراغ" میں "خون آفتاب" اور "شرار سنگ" میں "جلوۂ طور" کا مشاہدہ کیا۔"

"مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلۂ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔"

وحدتِ وجود کا مسئلہ جس کی طرف مندرجہ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا

ہے یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات کا ہے۔ مخلوق جس میں عالم طبیعی اور انسان سب ہی داخل ہیں، محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں اور اسی ایک نور ایزدی کے پرتو ہیں۔ ہم نے اپنی کوتاہ بینی سے ان اصنام خیالی کو حقیقی سمجھ لیا ہے اور تعینات کے ان پردوں نے ہمیں معرفت ذات سے محروم کر دیا ہے ؎

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے
(غالب)

اصل میں یہ احساس وحدت ایک کیفیت ہے جو قلب حال پر ایک خاص وقت میں آناً فاناً گزر جاتی ہے مگر جب زبان قال اسے تصورات کے جال میں پکڑ کر رکھنا چاہتی ہے تو الفاظ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انہی الفاظ کو شاعر اٹھاتے ہیں اور نظم کا خوشنما لباس پہنا کر اس قدر دلکش اور دلفریب بنا دیتے ہیں کہ سننے والوں کا دل و دماغ مسحور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اگر یہ قیل و قال محض تفریح کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ جو قوم عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے گھبرانے لگتی ہے اور ان سے بچنے کا حیلہ ڈھونڈھتی ہے وہ اس متصوفانہ شاعری کو اپنا

فلسفۂ حیات بنا لیتی ہے۔ کائنات کا موہوم ہونا نفس انسانی کا بے حقیقت اور زندگی کا بے ثبات ہونا سعی و عمل کا لاحاصل ہونا وہ خیالات ہیں جو شعر کے میٹھے سروں میں تھکی ہوئی قوم کو لوریاں دے کر سلا دیتے ہیں۔ پھر جب اپنی غفلت کی بدولت وہ دولت و حکومت قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو یہی دلفریب نغمے جو پہلے صبر و سکون اور کیف و سرور کا سبب ہوتے تھے اب قنوط و یاس اور حزن و ملال کا باعث بن جاتے ہیں اور اسے ایک بار گرنے کے بعد پھر اٹھنے نہیں دیتے۔ یہی ماجرا تھا جو مسلمان پر گذرا اور جس نے ان میں بے حرکتی بے اصولی اور بے عملی پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی امراض کا یہی سب سے بڑا سبب تھا جسے حکیم ملت اقبال نے پہچانا اور جس کے ازالے کی کوشش میں انہوں نے اپنی مسیحائی کی خداداد قوت صرف کی۔

اس عقیدے کو جو اقبال کے نزدیک ملت اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ہے وہ "نفی خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے "اثبات خودی" کے نظریہ سے رد کرنا چاہتے ہیں۔ خودی یا انانیت کا لفظ اردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے، مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لئے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے لیکن ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار

اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرار خودی کے دیباچے میں فرماتے ہیں "یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعیین ذات ہے۔"

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فلسفے کا آغاز ایک حیرت اور الجھن سے ہوتا ہے۔ وہ سوال جس نے اقبال کو الجھن میں ڈالا یہ ہے "یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کا شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا انا یا میں، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز سے نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے علما اور حکما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر

مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجہ کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتارنے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی .... مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے ...... میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔"

آیئے اب یہ دیکھیں کہ جس خیال کو اقبال نے یہاں مجمل طور پر نثر میں بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیلات اس باکمال سخنور کے فیض طبع سے شعر کا جامہ پہن کر کس قدر دل نشین، اور دل آویز، روح پرور اور روح افزا، جاں نواز اور جاں بخش بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں۔ ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اس نے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر

دیا۔ غیر خود کی علتِ غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدے کے لئے آئینے کا اور اس کے عملِ ارتقار کے لئے ہیولٰی کا کام دے۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعے سے اس کی اندرونی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلۂ ارتقار کو طے کرتی ہے اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم کشمکش اور کارزار ہے جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے، اسی نسبت سے اس کا درجہ مدارج حیات میں متعین ہوتا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است — ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است — پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے ؎

خودی کیا ہے راز درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

اول اس کے پیچھے ابد سامنے	نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی	ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر	ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے	فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

مخلوقات میں بہ اعتبار مدارج انسان اسی لئے سب سے برتر ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ بھی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے مگر اس کی ہستی محض اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالم فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی ادراک و مشاہدے کا پابند ہے ؎

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است	جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را	حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من	چہ زمان و چہ مکان شوخی افکار من است

جہان ما فرہی از دیدن ما	نہالش رُستہ از بالیدن ما
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست	کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست
جہان رنگ و بو گلدستۂ ما	زما آزاد و ہم وابستۂ ما

خودی او را بیک تار نگہ است   زمین و آسمان و مہر و مہ بست

بقول ڈیکارٹ کے انا یا خودی کی ہستی بدیہی ہے اس لئے کہ اسے
بلا واسطہ اپنا شعور ہوتا ہے۔ درانحالیکہ غیر خود یعنی عالم فطرت کی ہستی دلیل
کی محتاج ہے۔ اگر انسان کو اپنے وجود میں شک ہو تو یہ شک خود اس بات کا
ثبوت ہے کہ کوئی شک کرنے والا موجود ہے ؎

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است   نمودش چوں نمود این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست   یکے در خود نگر آن بے نشاں کیست
جہاں پیدا و محتاج دلیلے   نمی آید بہ فکر جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز ست   یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز ست
خودی را حق بداں باطل مپندار   خودی را کشت بے حاصل مپندار

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اسی طرح اس
کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے جیسا کہ ہم
اوپر کہہ چکے ہیں خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی
اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ
اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم

رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دُور کرتا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے! اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعاست | کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است | اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا | سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم | از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

یہ سوزِ آرزو طالبِ خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اسی طرح راہِ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی بیقراری اور بے چینی، اسی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ وہ بہشت کا سکون کیوں نہ ہو، رُوحِ انسانی کے لئے موت کا پیام ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد | دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب رُوئے | تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے | سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم | غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے　　نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کے منازلِ ترقی اس عالمِ زمان و مکان کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے شاعری کی چشمِ تخیل انسان کے جہد و عمل کے لئے اس کے ماوراء نئے نئے میدان دیکھتی ہے ؎

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں　　جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیِ فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس راہ میں ایک راہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق ہے۔ عشق اس مردِ کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفتِ نفس کے مدارج سے گزر کر خودی کی

معراج پر پہنچ چکا ہے محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کرے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس بزرگ شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت، یا خودی کو استوار کرے ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است	زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر	زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشت گلے	بوسہ زن بر آستانِ کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق	ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار	تا کمندِ تو شود یزداں شکار

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے ؎

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد	گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد	مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لافانی نصب العین کی محبت، فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے

اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

طلبِ ہدایت کے لیے کسی مردِ کامل کے آگے سرِ نیاز جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لیے اربابِ اقتدار کا دستِ نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے ؎

اے ز اہم کردہ از شیراں خراج
گشتہ روبہ مزاج از احتیاج

از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گدیہ گر نادار تر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخلِ سینائے خودی

وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر
گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر

اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب
می نخواہد از خضر یک جام آب

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس دولت مند کا طفیلی بن جاتے ہیں بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کرکے

نہ کمائے بلکہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے' اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے' سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے ؎

میکدے میں ایک دن اک مردِ زیرک نے کہا ۔۔۔ ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے ۔۔۔ کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید ۔۔۔ تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی ۔۔۔ دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی مالِ دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیسِ فطرت پر حکمرانی کرنا، دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا، مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے ؎

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ ۔۔۔ یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر ۔۔۔ بستۂ فتراکِ او سلطان و میر
فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند ۔۔۔ بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

باسلاطیں برفتد مردِ فقیر | از شکوہ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر | وارہاند خلق را از جبر و قہر
بر نیفتد ملتے اندر نبرد | تا درو باقی است یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست | سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری | اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری | اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ | فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی | ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

کمال ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری | کمالِ ترک ہے تسخیر خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا | تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوجاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود | قوتش فرماں دہِ عالم شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود　　ماہ از انگشتِ او شق می شود

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند　　ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند　　بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوش اند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و ترتیب بھی ضروری ہے (بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے) خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانونِ حیات کی پابندی جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے ؎

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند　　خویش را زنجیری آئیں کند
باد را زنداں گل خوشبو کند　　قید بو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم　　پیش آئینے سرِ تسلیم خم
سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است　　پائمال از ترکِ آں گردیدہ است
لالہ پیہم سوختن قانونِ او　　رقص پیرا در رگِ او خونِ او

قطرہ ہا دریاست از آئین وصل
ذرہ ہا صحراست از آئین وصل

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ازین ساماں روی

باز اے آزاد دستورِ قدیم
زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم

شکوہ سنجِ سختیِ آئین مشو
از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

دُوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنےٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے قابو میں لائے خصوصًا نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں غالب آئے ؎

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سراست

مرد شو آور زمامِ او بہ کف
تا شوی گوہر اگر باشی خزف

طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں

حبِ مال و دولت و حبِ وطن
حبِ خویش و اقربا و حبِ زن

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان اس درجے پر فائز ہوگا

انسانیت کا اوجِ کمال سمجھنا چاہئے۔ یہ نیابت الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرم سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے ؂

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر — از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

ہم نے اوپر اس ما فوق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے جسے اقبال "بے خودی" کہتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفسِ انسانی کو قطرے سے اور ذاتِ ایزدی کو دریا سے تشبیہہ دیتے آئے ہیں۔ اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائدار اور لازوال بن جاتی ہے ؎

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش
نرم رو مثلِ صبا گرداندش

چوں اسیر حلقۂ آئین شود　　آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب تک ہم نے اقبالؔ کے کلام سے تصورِ خودی کے وہ عناصر منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں جو عالمگیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے ان کی محبت کل نوعِ بشر کو محیط ہے۔ اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں ؎

من نہ گویم از بتاں بیزار شو　　کافرے شائستۂ زنار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشت پا بر ملتِ آبا مزن

گر ز جمعیت حیاتِ ملت است　　کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ　　لایقِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور　　تو زِ آذر من زِ ابراہیم دور

قیسِ ما سوداتی محمل نہ شد   در جنونِ عاشقی کامل نہ شد

ان کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب وملت کل نوع انسانی سے خطاب کیا ہے۔ لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا جاں بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ مشرق ومغرب کے کل انسانوں کے لئے ہے قطعی ثبوت "پیام مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے ۔ . . . . . مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک شرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کرکے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد اور اقوام کی نگاہ کو "جغرافی حدود سے بالاتر کرکے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید" ہے اسی کو انہوں نے اپنی تصانیف میں مدنظر رکھا ہے اور اسی کا پیام مغرب و مشرق کو دینا چاہتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خالص فلسفیانہ نظریے کی حیثیت سے انسانیت کا ایک عالم گیر تصور ممکن ہے، لیکن جب اس تصور کو ایک زندہ نصب العین کی صورت میں پیش کرنا ہو تو وسیع سے وسیع نظر رکھنے والا بھی اس پر مجبور ہے کہ انسانیت کی تصویر کسی خاص ملت کے آئینے میں دیکھے۔ اقبال کے لئے ملت بیضائے اسلام اس آئینے کا کام دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعے

سے ممکن ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتہ اتحاد نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا وسیع اور ہمہ گیر عقیدہ ہے۔

با وطن وابستہ تقدیر امم — بر نسب بنیاد تعمیر امم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
ملت ما را اساس دیگر است — این اساس اندر دل ما مضمر است
مدعائے ما مآلِ ما یکیست — طرز و اندازِ خیال ما یکیست
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
از سیاتِ بحر او خیزیم ما — مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
دین فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم
این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — این کہ یک جانیم از احسانِ اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازو — حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو

فرد کو حقیقی آزادی ملت اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوتی کیونکہ اسی

نے نوع انسانی کو حقیقی معنی میں حریت، مساوات اور اخوت کا نمونہ دکھایا
توحید کے عقیدے نے نسل ونسب کے امتیاز کو مٹا دیا۔ غریبوں کو امیروں کے
اور زیر دستوں کو زبردستوں کے تسلط سے آزاد کر کے عدل وانصاف کی
حکومت قائم کی اور اسلام کے رشتے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی
بنا دیا۔

امتے از ماسوا بیگانۂ　　بر چراغ مصطفےٰ پروانۂ
ناشکیب امتیازات آمدہ　　در نہاد او مساوات آمدہ
پیش قرآں بندہ و مولا یکی است　　بوریا و مسند و دیبا یکے است

عشق را آرام جاں حریت است　　ناقہ اش را ساربان حریت است
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید　　ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیری است　　باطل آخر داغ حسرت میری است
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست　　پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
کل مؤمن اخوۃ اندر دلش　　حریت سرمایۂ آب و گلش

تکمیل خودی کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ نفس زمان ومکان کی قیود سے
آزاد ہو جائے اور یہ بات بھی ملت اسلامی کے اندر حاصل ہو سکتی ہے جو خود

حدود زمانی و مکانی سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ اس کا اساس نسل و وطن کا مادی تخیل نہیں بلکہ توحید و رسالت کا روحانی عقیدہ ہے۔ نسل فنا ہو سکتی ہے وطن کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے۔ مگر کلمۂ توحید کا رشتہ لافانی اور لازوال ہے۔

جوہر ما با مقامے بستہ نیست ‏ ‏ بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود ‏ ‏ از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد ‏ ‏ بر اساس کلمۂ تعمیر کرد
ہر کہ از قید جہات آزاد شد ‏ ‏ چوں فلک در شش جہت آباد شد

امتِ مسلم ز آیات خدا است ‏ ‏ اصلش از ہنگامۂ قالوبلیٰ است
تا خدا اَن یُّطفئُوا فرمودہ است ‏ ‏ از فسردن ایں چراغ آسودہ است
رومیاں را گرم بازاری نماند ‏ ‏ آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست ‏ ‏ رونق خمخانہ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام شد ‏ ‏ استخوانِ او تہ اہرام شد
در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست ‏ ‏ ملت اسلامیاں بود است و ہست

ملت اسلامی کے لئے قرآن کریم آئین حیات کا اور اخلاق محمدی اُسوۂ

زندگی کا کام دیتا ہے۔ آئین الٰہی پر عمل کرنے سے اس کی سیرت میں پختگی اور آدابِ محمدی کی پیروی سے حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکز مشہود کعبہ اور اس کا نصب العین حفظ و نشر توحید ہے۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست | زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم | حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات | بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلمان زندہ است | پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

ملت از آئینِ حق گیرد نظام | از نظامِ محکمے گیرد دوام
ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات | بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

غنچہ از شاخسارِ مصطفےٰ | گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت | بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است | در جہاں دست و زبانش رحمت است

قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را دوام از مرکزے
راز دارِ رازِ ما بیت الحرام | سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

نوز پیوندِ حریمے زندہ ‌‌‌‌ تا طوافِ او کنی پائندہ
درجہاں جانِ امم جمعیت است ‌‌‌‌ در نگر سرِّ حرم جمعیت است

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست ‌‌‌‌ حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے ‌‌‌‌ گر مسلمانی نیاسائی دمے
آب و تابِ چہرۂ ایام تو ‌‌‌‌ در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجان را صلائے عام دہ ‌‌‌‌ از علومِ امتیٔ پیغام دہ
تا بدست آورد نبضِ کائنات ‌‌‌‌ وانمود اسرارِ تقویمِ حیات
در جہاں وابستۂ دینش حیات ‌‌‌‌ نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

یہ یک آئینی اور یک جہتی، ہم مرکزی اور ہم مقصدی ملت کو متحد کر کے ایک نفسِ واحد بنا دیتی ہے اور اس میں ایک اجتماعی خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس کی مجموعی قوت فرد کی خودی کو تقویت پہنچاتی ہے اور وسیع تر اور محکم تر بناتی ہے۔ ملت کا احساسِ خودی بھی فرد کے احساسِ خودی کی طرح اسی سے توسیع اور استحکام حاصل کرتا ہے۔ کہ کارزارِ حیات میں عالمِ خارجی کی قوتوں کا مقابلہ کرے، علم کے ذریعے سے ان کی حقیقت کو پہچانے اور عمل کے ذریعے انہیں تسخیر کرے۔ عالمِ اسباب کو حقیر جان کر ترک کر دینا غفلت کی

انتہا ہے۔ یہ فرد اور ملت کا میدان عمل اور ان کی عقل اور ارادے کی تربیت گاہ ہے۔ اگر انسان علم کی مدد سے اپنے خارجی ماحول پر غالب نہ آئے تو اس سے مغلوب ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔ اس لئے علم اشیاء بھی معرفت نفس کی طرح خودی کے نشو و نما کے لئے ناگزیر ہے۔

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرہ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر — تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ — عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را — دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است — امتحان ممکنات مسلم است
کاروان رہگذر است ایں جہاں — نقد مومن را عیار است ایں جہاں
گیر اورا تا نہ او گیرد ترا — ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر — نشہ زیر پردۂ صہبا نگر
تا قوی از حکمت اشیا شود — ناتواں باج از توانایاں خورد
علم اشیا اعتبار آدم است — حکمت اشیا حصار آدم است

ملت کے احساس خودی کی توسیع کے لئے علم کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی روایات کی یاد کو دل میں تازہ رکھے۔ تاریخ اقوام کی زندگی کے لئے قوت حافظہ کا حکم رکھتی ہے حافظہ ہی وہ چیز ہے جس سے فرد کے مختلف ادراکات میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ جب خارجی حیات کے ہجوم میں اسے "میں" یا "انا" کا مرکز ہاتھ آتا ہے تو یہی حافظہ اس احساس خودی کی حفاظت کرتا ہے بالکل اسی طرح تاریخ سے ملت کی زندگی کے مختلف ادوار میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور یہی شیرازہ بندی اس کے شعور خودی کی کفیل اور اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔ وہی قومیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں جو اپنے حال کا رشتہ ایک طرف ماضی سے اور دوسری طرف مستقبل سے استوار کرتی ہیں۔ زندگی نام ہی اس احساس تسلسل کا ہے۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر — کو بود از معنی خود بے خبر
نقش گیر این و آں اندیشہ اش — غیر جوئی غیر بینی پیشہ اش
تا ز آتش گیری افکار او — گل فشاند زرچک پندار او
چشم گیرائش فتد بر خویشتن — دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسائش کند — حفظ ربط دوش و فردایش کند

ایں "من" نوزادہ آغاز حیات — نغمۂ بیداری ساز حیات

ملت نوزادہ مثل طفلک است — طفلکے کو در کنار مادر است

بستہ با امروز او فرداش نیست — حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم است — سیئہ را بینندہ و از خود گم است

صد گرہ از رشتۂ او وا کند — تا سر تار خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بہ کار روزگار — ایں شعور تازہ گردد پائدار

نقش ہا بردارد و اندازد او — سرگزشت خویش را می سازد او

قوم روشن از سواد سرگذشت — خود شناس آمد ز یاد سرگذشت

نسخۂ بود ترا اے ہوشمند — ربط ایام آمدہ شیرازہ بند

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو — از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضی تو حال تو — خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن ار خواہی حیات لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراک تسلسل زندگی است — مے کشاں را شور قلقل زندگی است

اوپر کے صفحات میں اقبال کے تصور خودی کے دو پہلو آپ کے سامنے آگئے۔ ایک یہ کہ خودی کا غیر خود یعنی عالم خارجی سے، دوسرے یہ کہ

اس کا نفس اجتماعی یعنی ملّت سے کیا تعلق ہونا چاہیئے! ابھی ایک تیسرا پہلو
باقی ہے جو ان دونوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خودی
کا بہ حیثیت مخلوق کے اپنے خالق سے صحیح علاقہ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا
کہ خودی غیر خود سے ٹکرا کر اور اسکی قوتوں کو تسخیر کرکے استحکام اور توسیع حاصل
کرتی ہے اپنی فطرت کے قانون کی پابندی سے یعنی توحید و رسالت کے
روحانی عقیدے کی بنا پر ملت کے حبل متین مربوط ہو جانے سے پائندار اور
لازوال بن جاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ محدود لازوال ہستی اس ذات
لایزال سے جس نے اس کو اور کل کائنات کو پیدا کیا، کیا رشتہ رکھتی ہے۔

اب تک اقبال کے کلام کا موضوع فلسفۂ نفس اور فلسفۂ تمدن کے
مسائل تھے جن میں جذبات کو بہت کم دخل ہے۔ جذبات شاعری کی جان
ہیں اور خشک فلسفیانہ مسائل میں جو جذبات کے کیف و رنگ سے خالی
ہوں شعریت پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اقبال کا کمال فن ہے کہ انہوں
نے حکمت کو اپنے سوز دل کی حرارت سے شعر بنا دیا۔ یہ ان کے حصے کی چیز ہے
جس میں ایشیا کے قدیم و جدید شاعروں میں بہت کم ان کے ساتھ شریک ہیں
لیکن اب وہ تصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں واردات قلب کو
ناتمام تصورات کا ایک ہلکا سا لباس پہنا کر الفاظ میں ادا کرنا ہے ایک

لحاظ سے یہ مرحلہ ایشیائی شاعر کیلئے سب سے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کہ یہ احساسات
سکی طبیعت میں رچے ہوئے ہیں اور پھر ان میں کچھ اس درجہ شعریت ہے کہ خود بخود شعر
کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو یہ میدان اس قدر پامال ہو چکا
ہے کہ اب میں کوئی نئی راہ نکالنا نہایت مشکل ہے لیکن اقبال کا طرز خیال ہی سب سے
لا ہے۔ اس لئے ان کے تصوف نے خود بخود اپنے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے
ر وہ اسی منزل کی طرف لیجاتا ہے جو ان کے فلسفہ حیات کی منزل ہے۔ یہی وہ نازک
ام ہے جس میں روحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آ کر کھو جاتی ہیں بادہ معرفت کے
لے ہی جام میں علم کائنات اور احساس خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ
ال ہی کا ظرف ہے کہ عالم بے خودی میں بھی انہیں اتنا ہوش رہتا ہے کہ
ں امانت کو نہیں بھولتے جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے۔

ہم نے اوپر لکھا تھا کہ طالب خودی اس مرد خدا کی محبت میں جو مدارج خودی میں
ں سے برتر ہے سرشار ہو جاتا ہے پھر کیا ٹھکانا ہے اس کیف و مستی کا جو خودی کے مبدأ
تھا اور خالق و پروردگار یعنی خدائے تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہے
سان اپنے دائرہ ارتقا میں خودی کے کل مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص
تمام ہی رہتا ہے اور کمال و تمام کا وہ جلوہ جو اسے ذات مطلق میں
ر آتا ہے اس کے دل کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کشش کا

نام عشق حقیقی ہے عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ آرزو، اور جستجو، دیدار، وصل۔ قدیم صوفی شعرا کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدود تا محدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز و گداز آرزو کی ہے۔ دوسری کیف دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذت دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفس انسانی روح مطلق سے جدا رہتا ہے اور درد جدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر۔

اب اس اجمال کی تفصیل اقبال کے کلام میں ملاحظہ ہو۔ صوفی شعرا کے نزدیک عالم شہود کی تخلیق کی غایت یہ ہے شاہد مطلق اس آئینے میں اپنے جمال کا نظارہ کرے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید از نقش این و آن بہ تماشائے خود رسید

فرق یہ ہے کہ اوروں کے نزدیک ماسوا محض موہوم ہے اور اقبال کے

نزدیک موجود۔ غالب کہتے ہیں۔

شاہدِ ہستئ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

مگر جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ اقبال کے خیال میں کائنات کے اندر حیاتِ حقیقی یعنی خودی کی قوت مضمر ہے اور اس اعتبار سے مظاہر کائنات محض وہم ہی وہم نہیں ہیں بلکہ کم سے کم بالقوۃ وجود رکھتے ہیں جب یہ قوت رفتہ رفتہ ارتقا پاکر انسان کی ذات میں شعور اور ارادہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا وجود نمایاں ہو جاتا ہے۔ میلادِ آدم دنیا میں ایک نئے دورِ حیات کا آغاز ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی ہستی کا شعور اور ہستئ مطلق کی معرفت کا حوصلہ رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد جہانِ دگرے پیدا شد

یہ نیا مخلوق سوز و ساز آرزو سے معمور ہے۔ اس کے دل میں ابتدا سے نہ صرف اپنی محدود حقیقت بلکہ ذاتِ ایزدی کی نا محدود حقیقت کا محرم بننے کی لگن ہے۔ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل و کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

بہ گداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بہ حریم ناز کردن

گہے جز یکے نہ دیدن بہ ہجوم لالہ زارے
گہے خار نیش زن را ز گل امتیاز کردن

ہمہ سوز ناتمامم ہمہ درد آرزویم
بہ گمان و ہم یقیں را کہ شہید جستجو یم

پہلے اس کی آرزو صرف یہیں تک محدود ہوتی ہے کہ ماسوا کے پردے سامنے سے ہٹ جائیں اور شاہد مطلق کا جمال بے حجاب نظر آئے۔

چند بروئے خود کشی جلوۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمتِ عام خویش را
بند نقاب بر کشا ماہِ تمامِ خویش را

اگر وہ طاقت دیدار رکھتا ہے تو یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ مگر صرف اس حد تک کہ کبھی کبھی حسن مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور آناً فاناً چھپ جاتی ہے۔

نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم نقاب او را
اگر تابِ نظر داری نگاہے می تواں کردن

کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر
آتے ہیں نالوں کے جواب آخر

تو ز راہِ دیدۂ ما بہ ضمیرِ ما گزشتی ‏ ‏ مگر آں چناں گزشتی کہ نگہ خبر نہ دارد

مگر اس سے طالبِ دیدار کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کا اضطرابِ قلب اور بڑھ جاتا ہے اور اس کشمکش سے عاجز آ کر وہ چاہتا ہے کہ بحرِ وجود اپنی کشش کو اور بڑھا دے اور اس کے قطرۂ خودی کو اپنے آغوش میں لے کر سکونِ دائمی بخشے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را ‏ ‏ یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ‏ ‏ ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں ‏ ‏ یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو ‏ ‏ یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن اس دیدار و وصل میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں قطرہ دریا میں مل کر اپنی خودی کو فنا نہ کر دے اور یہ بات اقبال کو کسی طرح گوارا نہیں۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ

نہ گیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من ‏ ‏ بہ ایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را

وہ ایسا وصل نہیں چاہتے جس میں قطرے کا انفرادی وجود مٹ جائے لیکن ان کے خیال میں یہ اندیشہ بے جا ہے۔ دیدار و معرفت الٰہی سے خودی کی آب و تاب کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے

کمال زندگی دیدار ذات است | طریقش رستن از بند جہات است
چناں با ذات حق خلوت گزینی | ترا او بیند و او را تو بینی
منور شو ز نورِ "من یرانی" | مژہ بر ہم مزن تو خود نہ مانی
بہ خود محکم گزر اندر حضورش | مشو ناپید اندر بحر نورش
چناں در جلوہ گاہ یار می سوز | عیاں خود را نہاں او را برافروز

اگر قطرے کے دل میں کبھی اپنی کم مائگی کا خطرہ گذرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دریا کے آگے اس کی ہستی معدوم محض ہے تو خود بحر حقیقت اس کی خودی کی بقا کی ضمانت کرتا ہے۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید | خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ "جائے کہ دریاست من کیستم | گر او ہست حقا کہ من نیستم"
ولیکن ز دریا برآمد خروشش | ز شرم تنک مائگی رو مپوش
ز موج سبک سیر من زادۂ | ز من زادۂ در من افتادۂ
بیا سائے در خلوت سینہ ام | چو جوہر درخش اندر آئینہ ام

گہر شو در آغوشِ قلزم بزی	فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

اسی طرح قطرۂ ناچیز میں جوشِ عشق وہ ظرف پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دریا کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

در سینۂ من دمے بیاسائے	از زحمت و کلفت خدائی

حفظ خودی کا خیال عشق کے منافی نہیں بلکہ عین عشق ہے۔ حسن کا عیار عاشق کا دل ہے اور بزمِ حسن کا فروغ عاشق کے دم سے ہے۔ وہ اپنی خودی کی حفاظت اپنے لئے نہیں بلکہ معشوق کی خاطر کرتا ہے۔

خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست	تجلّی ہائے او بے انجمن نیست
کہ برقِ جلوۂ او بر جگر زد	کہ خود آں بادہ و ساغر بہ سر زد
عیارِ حسن و خوبی از دلِ کیست	مہ او در طوافِ منزلِ کیست
الست از خلوتِ ناز کہ برخاست	بلی از پردۂ ساز کہ برخاست؟
اگر مائیم گرداں جام ساقی است	بہ بزمش گرمیٔ ہنگامہ باقی است
مرا دل سوخت بر تنہائی او	کنم سامانِ بزم آرائی او
مثالِ دانہ می کارم خودی را	برائے او نگہ دارم خودی را

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، محدود کا حقیقی وصل نامحدود سے یہی

ہے کہ اس کے اندر محو ہو جائے بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیش نظر ہے حقیقت میں وصل نہیں ہے۔ یہ ایک خاص حالت ہے جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوز و ساز فراق اور بڑھ جاتا ہے۔

اودر من و من در وے ہجراں کہ وصالست ایں
اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

ازو خود را بریدن فطرت ماست | تپیدن نا رسیدن فطرت ماست
نہ مارا در فراق او عیارے | نہ او را بے وصالِ ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است | فراق ما فراق اندر وصال است

کبھی درد فراق میں اقبال اپنے آپ کو یہ کہکر تسکین دیتے ہیں کہ سوز و گداز کا یہ کیف انسان ہی کا حصّہ ہے۔ خدا اس سے محروم ہے۔

سوز و گداز حالتے است بادہ ز من طلب کنی
پیش تو گر بیاں کنم مستئ ایں مقام را

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی | مقام بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

کبھی شوخی تخیل سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بندہ خدا کے ہجر میں بیچین

ہے۔ اسی طرح خدا بھی بندے کے فراق میں بے قرار ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو ست

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

بہر حال یہ جدائی انسان کے لئے مبارک ہے۔ کیونکہ یہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے۔

جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را ساز گار است

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است
دگر پائندہ ایم از دردمندی است

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

گرمی آرزو فراق، لذت ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس نظریۂ حیات کا جو اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ فلسفی شاعر دنیا میں ایک ایسا دل لے کر آیا جو سوز حیات

اور درد کائنات سے لبریز تھا۔ اور ایک ایسا دماغ جو زندگی کے
اسرار و معارف کا محرم تھا۔ اس نے دنیا کو ایسی حالت میں پایا کہ مشرق
خصوصاً اسلامی مشرق جو اب تک خواب غفلت میں مدہوش تھا
کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہتا ہے۔ مگر غلامی کا کابوس جو اس کے دل و دماغ
پر مسلط ہے اسے ہلنے نہیں دیتا۔ مغرب جس نے اپنی بیدار مغزی سے
ربع مسکوں پر اپنا سکہ بٹھا لیا ہے طمع و نخوت کے نشے میں چور انقلاب
کی ان قوتوں سے جو خود اس کے اندر سے ابھر رہی ہیں ٹکرایا چاہتا ہے[۱]
اس کا دل ٹڑھا ایشیا کی بے حسی اور بے بسی پر جو قید مذلت میں گرفتار
ہے اور کچھ نہیں کرتا اور یورپ کی ناعاقبت اندیشی پر جو قعر ہلاکت
میں گرنے والا ہے اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اس نے ایک کی بے عملی اور
دوسرے کی بے بصری کے اسباب پر غور کیا اور اس کی حقیقت میں
نظر سطحی چیزوں سے گذرتی ہوئی ان تصورات حیات پر جا کر پڑی جن
پر ان دونوں تہذیبوں کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایشیا
کے قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دست عمل کو شل کرنے والا
نفی خودی اور نفی کائنات کا فلسفہ ہے۔ اب رہا یورپ تو اس

---

[۱] یہ مضمون اکتوبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ حالت اس وقت تھی۔ آج تو یورپ
ٹکرا کر پاش پاش بھی ہو گیا۔ (طلوع اسلام)

بیں شک نہیں کہ اس نے اثبات خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدان عمل میں قدم بڑھایا۔ اور فرد وجماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو اُستوار بنایا۔ لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کسی عالمگیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادی نظریے پر تھی اس لئے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہوگئیں صحیح نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام کا ہے جس نے ایشیا کی روحانیت اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دین فطرت کی راہ دکھائی۔ مگر گردش زمانہ سے اسلام کے پیرو بھی وحدت وجود کے عقیدے کی بدولت جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے اسی غفلت وجمود کا شکار ہوگئے جو ایشیا کی اور قوموں پر طاری تھا۔ اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبال اپنے جاں بخش اور جاں فزا نغمۂ امید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا ہے تاکہ وہ اس خدمت کو جو خدا نے اس کے سپرد کی ہے پورا کرے اور دنیا کو اس روحانی اور مادی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی ہے، نجات دے۔ اقبال کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست سیاسی اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے۔ اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لئے وہ پہلے مسلمانو

کے اور پھر کل اقوام عالم کے قلوب میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ مگر اس کا پیام فضلائے عالم میں گونج رہا ہے۔ اور گونجتا رہے گا۔

تمّت

سنہ ۱۹۴۴ء

سید محمد شاہ ایم۔اے پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر
چھپوا کر شائع کیا

علمائے کرام کا مستقبل ۔ علما کو کیا کرنا چاہیئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام ۔ (ایک دلنشین موازنہ) ” ” ” ۔ ۸ر

انتخاب غالب ۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب ۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندستانی مسلمان { سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات ۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال } عہ ۱۲ر

المنبہات { عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف } عہ

اسلامی پارٹی کا آئین { مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے ۔ از مولانا عزیز ہندی } عہ ۸ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفۂ اضداد کی تشریح) ۔ از مولانا عزیز ہندی ۔ ۴ر

ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے ۔ ” ” ” ۔ ۴ر

القول الجمیل (عربی) ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ عہ

تقویۃ الایمان (اردو) ۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۔ عہ ۸ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ۔ ابو القاسم رفیق دلاوری ۔ عہ ۸ر